جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر رئیس کی محفل میں گئی، حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ ان ہی کی بدولت آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسے میں منہ کھولنے کی جرأت ہوئی، شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا، اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد کریما، مامقیما، محمود نامہ صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا، خصوصاً اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی، فقرے فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کی۔ املا درست کرایا گیا، خط لکھوائے گئے۔ گلستان کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھا جاتا ہے۔ عربی کی صرف نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں، اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

(4)

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کی طرح
مکتب عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا گوہر مرزا۔ حد کا شریر اور بد ذات۔ سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی، اس کے کان دکھا دیے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی، کہیں کتاب پر دوات الٹ دی۔ غرض اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے، مگر وہ اپنی آنی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میری گت بناتا تھا، کیوں کہ میں سب سے اکیلی اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔ میں نے بھی مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے اکثر مار پٹوائی، مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں ہی چغلیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو اس بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آ جاتا تھا۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں۔ نواب سلطان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازے میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ انہی سے یہ

لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی، مگر دس روپے ماہ بہ ماہ لڑکے کی پرورش کے لیے دیے جاتے تھے اور بیگم صاحبہ سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں، وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپن ہی سے ذات شریف تھے۔ تمام محلے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا، کسی کی کنکیا چھین لی، کسی کی مرغی کی ٹانگیں توڑ دیں، کسی لڑکے سے چرکوؤں کا پنجرہ دیکھنے کو مانگا، اس نے دے دیا، آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی، سب چرکوے پھر سے اڑ گئے۔ غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ آخر ماں نے عاجز ہو کر محلے کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھادیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی، ایک لڑکے کی جوتی کنوئیں میں ڈال دی۔ ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے، حضت نے ان کا نیا چڑھواں جوتا حوض میں تیرا دیا، خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں کہیں سے مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب ہی مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا، اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پر لے آئے۔ دروازے پر سے پکار کے کہا "لو صاحب اپنا لڑکا، ہم اسے نہ پڑھائیں گے۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب تو ادھر گئے، گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ تھیں نہیں، مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی:- اے ہے مولوی کاہے کو، موا قصائی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے طمانچوں کے سجا دیا۔ اے لو، کان بھی تو لہولہان کر دیئے۔ نا بی بی، ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے۔ آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چمکار کے دلار کے پڑھاتے ہیں۔

بنو نے چھوٹتے ہی کہا "پھر بوا حسینی، اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔"

بوا حسینی:- لے تو جاؤں، مگر بہت دور ہے۔

بنو:- تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی، شام کو بلوا لیا کروں گی۔

بوا حسینی:- اچھا تو بھجوا دیا کرو۔

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا، اس لیے کہ بوا حسینی کو اپنے حسن خدمت پر پورا بھروسا تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لیے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی، لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

----- ----- -----

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھی کو ستاتا تھا۔ دن رات داد بیداد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت بہت مارا، مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ آخر میری اس کی صلح ہو گئی، یا یوں کہیے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہو گا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔ جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں، میرا سن کوئی تیرہ برس ہو گا اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزا آنے لگا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی (ڈومنی کا لڑکا تھا) قدرتی لے دار۔ بتانے میں مشاق، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ ادھر میں لے سرے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسہ ہوتا تھا۔ میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔ کبھی وہ گا رہا ہے، میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی، کیونکہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔ سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو امیر جان یاد تو ہوں گی؟

رسوا:۔ یاد ہیں، کہے جاؤ۔

امیر جان کا وہ زمانہ جب وہ مفتخر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں، اللہ رے جوبن کے ٹھاٹھ! وہ اٹھتی ہوئی جوانی!

کھلتی	کھلتی	وہ	چمپئی	رنگت
بھولی	بھالی	وہ	موہنی	صورت
بانکی	بانکی	ادائیں	ہوش	ربا
ترچھی	ترچھی	نگاہیں	قہر	خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں!

رسوا:۔ اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے، الگنی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت

ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراؤ:۔ کہاں دیکھا تھا؟

رسوا:۔ انھی کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے ایک شاہ صاحب گیروے کپڑے پہنے، ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا اس کو سلام کر لیتے تھے، کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراؤ:۔ سمجھ گئی! وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔

رسوا:۔ جی ہاں، کیا میں نہیں جانتا!

امراؤ:۔ اچھا تو اب وہیں رہتی ہیں؟

رسوا:۔ ان کی مصاحبت میں ہیں۔

امراؤ:۔ اور ان کا حال کیا ہے؟

رسوا:۔ وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں۔

امراؤ:۔ کون حکیم صاحب؟

رسوا:۔ آپ نہیں جانتیں۔ نام بھی بتا دوں گا، تب بھی آپ نہیں سمجھیں گی، پھر کیا فائدہ؟

امراؤ:۔ خیر کچھ بتا دیجیے، میں سمجھ جاؤں گی۔

رسوا:۔ وہ نخاس۔۔۔۔۔

امراؤ:۔ خوب جانتی ہوں۔ یہی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو کرتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسے کا تو ذکر ہی کیا ہے، اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے۔ چار چار مہریاں ساتھ۔ ایک گڑ گڑی لیے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے، ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔

امیر جان، گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں۔ خود گانا جانتی نہیں تھیں، مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا، مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا۔ اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی، شرارت کوئی بات۔۔۔۔۔!

رسوا:۔ کیوں نہ ہو، کس ماں کا بیٹا تھا!

امراؤ:۔ اہاہ! تو کیا آپ نے بنو کو بھی دیکھا تھا؟

رسوا:۔ (مسکراتے ہوئے) جی ہاں، آپ بھی قیاس کر لیجیے۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب! آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں!

رسوا:۔ خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا۔

امراؤ:۔ تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگزشت کو آگ لگائیے۔

رسوا:۔ مذاق کے لیے شب بھر باقی ہے، آپ اپنا قصہ کہیے۔

امراؤ:۔ دیکھیے دوسری ہوئی۔ اچھا سنیے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے کہیں کھسک جائے۔ اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے۔ اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔ پھر ایک ایک کمرا ہے اور ہم ہیں۔ آج امیر جان کے پاس، کل جعفری کے کمرے میں، پرسوں ببن کے ہاں۔ پھر جہاں جاؤ خاطر مدارات، میوہ مٹھائیاں، حقہ پان۔

رسوا:۔ آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟

امراؤ:۔ جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی، شوقیہ پیتی تھی، پھر تو نگوڑی لت ہو گئی۔

رسوا:۔ گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی ہو؟

امراؤ:۔ خدا نے اس سے تو آج تک بچایا، مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔ وہ بھی اب شروع کی ہے۔ کربلائے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی، آئے دن زکام رہتا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا افیون کھاؤ، کھانے لگی۔

رسوا:۔ اور وہ چیز نزلے کو روکنے والی؟

امراؤ:۔ اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا:۔ کیا تائب ہو گئیں؟

امراؤ:۔ مدت سے۔

رسوا:۔ واقعی کیا بری چیز ہے، اپنا تو یہ حال ہے:

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

kitaabiyat.pk

امراؤ:- ہائے کیا شعر کہا ہے! مرزا صاحب! قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں، پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا:- آپ بھی شغل کیجیے گا؟

امراؤ:- توبہ!

رسوا:- توبہ!

ابر بھی ہے، ہوائے سرد بھی ہے
پھر وہ، یادش بخیر، یاد آئی

امراؤ:- بس اب طبیعت کو روکیے، جمائیاں آنے لگیں، للہ اس ذکر کو جانے دیجیے۔

رسوا:- جانے دیجیے۔

امراؤ:- مذاق سے بھی معاف رکھیے:

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی!

رسوا:- واللہ امراؤ جان، کیا شعر ہے!

امراؤ:- تسلیم۔

دیکھ کے مشہد ادا ان کو
لالہ و گل کی سیر یاد آئی!

رسوا:- ماشاء اللہ! طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو، عالم شباب کے ذکر کی تاثیر ہے۔

امراؤ:- جی نہیں، شراب کے ذکر کی تاثیر ہے:

زاہدو! آج ہم کو پھر وہ شے
جس سے ہے تم کو بیر، یاد آئی

رسوا:- آہاہاہا! کیا قافیہ نکالا ہے، اور کہا بھی خوب ہے!

امراؤ:- کعبے سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ
پھر وہی دیر و در یاد آئی

رسوا:- اے کیا کہنا! یہ "کعبے سے پھر کے" کیا خوب کہا ہے!

امراؤ:- مرزا صاحب! اسے مطلع نہ کر دیجیے:-

پھر کے کعبے سے سیر یاد آئی
پھر ہمیں راہ دیر یاد آئی

رسوا:- خاصہ۔

امراؤ:- روش وحشی و طیر یاد آئی
دشت وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا:- یہ مطلع بھی برا نہیں ہے۔

امراؤ:- یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے
کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

رسوا:- میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دہرانا شروع کیجیے۔

ہوا بھی، ابر بھی، گلزار بھی، شراب بھی ہو !
یہ سب تو ہو، مگر اکلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ:- واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل ہی مردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب۔ اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گزرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہو۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم، ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب ہی تو تھے۔ دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گرامی دلی سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصے تقسیم کیے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ، خانم کی اکلوتی لڑکی تھی، جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی کم سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کمپا مارا، بے چارہ پھنس ہی تو گیا۔ پچیس تیس

ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسے میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔

مرزا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں، مگر اس بے باکی کا ایک زمانہ خاص ہوتا ہے۔ سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں، سن سے اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیے تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں بھی عورت ذات ہیں، ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہو گا؟

رسوا:۔ کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیے۔

امراؤ:۔ اوئی! تو کیا پڑھنے لکھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی!

رسوا:۔ اچھا اچھا تو آپ کہیے، فضول باتوں سے میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔

امراؤ:۔ کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجیے گا۔

رسوا:۔ اور آپ کیا سمجھتی ہیں؟

امراؤ:۔ ہائے فضیحت! توبہ کیجیے، یہ مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔

رسوا:۔ خیر اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں:

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ:۔ نوج آپ سے کوئی محبت کرے!

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

رسوا:۔ کس کا شعر ہے؟

امراؤ:۔ یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں؟

رسوا:۔ ہاں سمجھا۔ تو یہ کہیے کہ آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔

امراؤ:۔

جاتے ہیں جان بیچ کے بازار عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے بغیر

رسوا:- اور وہ شعر یاد ہے وہ تقاضا کیے بغیر؟

امراؤ:-

وعدہ ہو یا کہ قول، وہ ایسے ہیں نا دہند
ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کیے بغیر

رسوا:- اور کوئی شعر یاد ہے؟

امراؤ:- اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔

رسوا:- یہ تو بہت بڑی غزل تھی، دیکھنا کہیں پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

امراؤ:- ابھی سے نہ منگوالو؟

رسوا:- خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے۔ وہ تو ہرگز نہ لکھیں گے۔

امراؤ:- یہ بھی کوئی بات ہے؟

رسوا:- جی ہاں، آپ کو نہیں معلوم۔ مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔

امراؤ:- اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر اور یاد آیا:

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر

اور سنیے:-

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر

رسوا:- میری بھی غزل اسی طرح میں تھی، مگر خدا جانے کیا ہوئی، صرف مقطع یاد رہ گیا تھا۔

امراؤ:- مقطع پھر سنائیے، کیا خوب کہا ہے!

رسوا:-

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم

kitaabiyat.bl

چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ:۔ واقعی خوب کہا ہے! مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف دیا۔

رسوا:۔ تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میرا نام نہیں جانتے، نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں، مگر میں تو خوش ہوں، اس لیے کہ انگریزی رسم کے مطابق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہو گا۔

رسوا:۔ لے اب ٹالیے نا، جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔

امراؤ:۔ کیا زبردستی ہے؟ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔

رسوا:۔ بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہو گی!

امراؤ:۔ آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں، ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں، وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔ واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات، یہ رسم تو کچھ اچھا نہیں ہے۔

رسوا:۔ آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے، اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں پٹی جا رہی ہیں اور یہ خوش ہیں، باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کو جو بے ہودگیاں با عصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں اس کا ذکر بھی فحش سے خالی نہیں۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجیے، آپ بیتی کہیے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔

امراؤ:۔ آپ نہ مانیے گا، لے سنیے۔

جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی، خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہو گئی، آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں ان کی

نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سجا دیے گئے تھے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے، فرش پر ستھری چاندنی کھنچی ہوئی، بڑے بڑے نقشی پاندان، مقابے، حسن دان، خاصدان، اگالدان اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جلبی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی، جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، ادھر ادھر ہانڈیاں۔ سرشام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ دو دو مہریاں، دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوب صورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے، سامنے پاندان کھلا ہوا ہے، ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں، چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہی نہیں کرتیں۔ جو ہے انھی کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ زمین آسمان ٹل جائے، مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ کلیجہ نکال نکال کے دیے جاتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی نہیں قبول ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ جنت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے، مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے، مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجے میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں، لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے، کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہیں ان کی طرف ہیں، یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر ہی سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں۔ اور لطف یہ کہ دل میں کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی بیچ ہے، یہ بھی ہیچ ہے، فقط بناوٹ۔ اگر وہ بے چارہ اس فریب میں آگیا، پھر کیا تھا، پہلے بظاہر خود مرنے لگیں:

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور
یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں ان کے دشمن، آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں، مگر یہ کرشمے دیکھ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی، ان کو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے، اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں، اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں، نہ کسی پر جان دیں۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جو در و دیوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی، اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہتے تھے۔ ایک طرف اس کوٹھری میں چولھا بنا ہوا تھا، اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں دو بد قلعی سی پتیلیاں، لگن، توا، رکابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی رکھی رہتی تھی۔ اس کے اوپر دو تین دالیں، نمک، مصالحہ ہانڈیوں میں، اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں، سوختے، مصالحہ پیسنے کی سل، بٹا۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں، کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت کی بتی پڑی ہے۔ موا اندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اکساؤ، لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن، دال کی پتیلی، چپاتیاں، مولوی صاحب کے واسطے ڈھانک کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا چھینکا تو چولھے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا، جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا۔ اگر پلنگ پر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تو سالن کی یہ پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔ صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں، اور شام سے نو بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور سارنگی کے گزوں کی مار۔ یہ ہمارا پیار اخلاص تھا۔ یہ سب کچھ تھا، مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا، اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی، بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی، اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا:۔ تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو، اس وقت تو اور بھی جوبن ہو گا۔

امراؤ:۔ تسلیم! خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجیے، بالکل بے محل اور بے موقع ہے، معاف

کیجیے گا۔ مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی، ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا:۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کی آپ کی طرف توجہ نہ ہو، نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی، مگر بات یہ تھی کہ آپ کی مسی نہیں ہوئی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لیے آپ سے کوئی نہ بولتا ہو گا۔

امراؤ:۔ شاید یہی ہو، مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی "بی دولتی اپنے تیہے میں آپ کھولتی" اپنی ہمجولیوں کو دیکھ دیکھ کے پھکی جاتی تھی، کھانا پینا حرام تھا، راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی چوٹی کا شوق ہوا۔ کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا، اس لیے کہ کوئی چوٹی گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے، میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا؟ وہی بوا حسینی، وہ بھی جب انھیں فرصت ہوئی، نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں، سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا۔ اور سب رنڈیاں دن میں تین جوڑے بدلتی تھیں، یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کارچوبی جوڑے پہنتی تھیں، یہاں وہی گلبدن کا پاجامہ، ململ کا دوپٹا، بڑی بڑائی ہوئی لچکے کی تیلی دے دی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس، مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانے سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزیداریوں کا خیال تھا، مجھے کون بیٹھنے دیتا!

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا، کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی، وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اسی کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا، کہیں دو

نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں، مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوا سوہن کی ٹکیہ لیتا آیا، مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا، وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے، مگر اس ایک روپے کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس سے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے، مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا، وہ روپیہ بہت دنوں تک میں نے جگو رکھا، اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا، تو کیا بتاؤں گی؟ راز داری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آئی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

(5)

ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کم بخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا۔ اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے، کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں، ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گزر رہی ہے، دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے، مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے، کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں میری آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ آخر بے ہوش ہو گئی۔۔۔۔۔ صبح کو چور کی ڈھونڈیا ہوئی۔ وہ کہاں ملتا ہے! خانم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں، بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے، مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا:۔ یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہو تو کیوں بتاؤں۔

امراؤ:۔ خیر اب حاشیے نہ چڑھائیے، سنتے جائیے۔

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی

ہے۔

رسوا:۔ کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا۔

امراؤ:۔ امیدیں خاک میں مل گئیں؟ خانم کو آپ نہیں جانتے، ایک ہی لکھا بیسوا تھیں۔ اس معاملے کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور التیام کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید و باید۔

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہد ہد پھنس ہی گیا۔ ان دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحب زادے طالب علمی کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ گھر سے خوش، والد مرحوم ان کے رشوت نذرانے کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف بے جا کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آکر اچھے رہے، پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی، علم تماش بینی میں طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے، لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہم راہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجا کا لقب دیا، مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی اور آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے، اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی داڑھی منہ پر تھی، لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کتروا ں ہوئی، پھر خشخاشی اور تھوڑے دنوں کے بعد بالکل صفایا ہو گیا۔

داڑھی منڈانے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بدنما نکل آیا، مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ، چیچک کے داغ، بھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گال پچکے ہوئے، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنگنا سا قد، غرض یہ کہ بہ ہمہ صفت موصوف تھے، مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ پہروں آئینہ سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہو گئیں۔ بال بڑھائے گئے، گھونگھر بنایا گیا، نکے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی، اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا گیا، بڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی دربار داری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی، دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی، بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھٹن جان سے مادر پدر ہوتا ہے، ہگن نیپیں لگاتی ہیں، حسنا نے جوتا کھینچ مارا، آپ ہیں کہ ٹھی ٹھی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا، مگر نائکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہو گیا، اس کی نائکہ کو مجمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی

تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔

سر شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ ان کی ہر ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے، خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے۔ اور تو جو کچھ تھا منہ سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب ہی بنالیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریا لے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی، تمام مشاعرہ چونک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے، آپ خوش ہوتے تھے، جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بے چاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے، مولوی بن کے آئے گا، جو کچھ یہ لکھ بھیجتے تھے، بھیج دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے بے فکرے، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خورے آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انھی لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا "ناصاحب! ابھی وہ کم سن ہے" اور ان کی التجا، منت و زاری، بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غم خواروں کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوا۔ اس روپے کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیے۔ بیس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے۔ پانچ توڑے گن دیے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے، پانچ سو روپے نذر و نیاز کے نام سے لے مریں۔ خلاصہ یہ میں آپ کے سر منڈھ دی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنؤ میں رہے، سو روپے ماہ وار دیتے تھے، فرمائش کا ذکر نہیں۔ جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا، خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں، خدمت گار میرے لیے خاص ملازم ہوئے۔ پھاٹک کے پاس والا کمرا میرے رہنے کے لیے سجا دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی، شریف زادے میرے پاس بیٹھنے لگے۔

گل چین اول گوہر مرزا مجھ سے ہر زمانے میں برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی، اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا، جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنو بڑھیا ہو چکی تھیں، کوئی پوچھتا نہ تھا، اس لیے گوہر مرزا کے صرف کی خبر

گیری میرے ذمے ہی تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا، ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کے مجرے میں انھی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کے اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے، یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کہتے ہیں، ہر تال پر واہ واہ کہتے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے، یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانا ملتا ہے۔ خاطر مدارت اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام واکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی، انھی کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے، ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں، نہیں معلوم آپ سے کیونکر ملتی ہوں۔ اب ان کے آنے کا وقت ہے، مجھے جانے دیجیے۔ وہ تو ہمیشہ کے ہیں، آپ اس طرح کیا نباہیے گا۔"

تماش بین ان سے دبتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی، یہ حمایت کو مستعد۔ شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات، بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماش بین ایک طرف، خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے رنڈی ان کو پیار کرتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو ان کے ساتھ نکل کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دیے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کے لے گیا۔

ایک دفعہ جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کان سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپے کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلہ پن تھا، کسی پر بند نہ تھیں۔

اور دں کا ذکر کیا، خانم صاحب پچاس پچپن برس کے سن میں میرا ولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار تھے، جوان تھے، کسرتی بدن، اچھی اچھیوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا، کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، نان شبینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپے لگا کے شادی کر دی، مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے، گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب، کوئی ستر برس کا سن، کمر جھکی ہوئی، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ افیم، گنا، ریوڑیاں، ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے، ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے برملا فرمائش کہا: "جاؤ چھو کریو! نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں! جیسی رنڈیاں ویسے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں، جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی، ماں باپ نے شادی ٹھہرائی، آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیے، ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گزرا، آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمہارا بھی؟" سب نے سر جھکا لیا۔

(6)

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے

یوں تو بسم اللہ کی مسی میں پہلے پہل ناچی گائی تھی، مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ دری کس شان سے سجی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا تھا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند، تکیے، سامنے رنگ رنگ کے مردنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں اور گلوریوں کی خوشبو سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا ہو گا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی

آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویئے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوک زباں تھیں۔ گلا وہ کہ چار محلے ادھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب ! واقعی کیا رنگ محفل دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی، مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کرتی کیا ہیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ کیسے جمے گا۔

پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی۔ مگر اس وقت کی پھرتی، چالاکی، الہڑپن!

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا !

گت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرا دی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے دوسرا مطلع اک ذرا بتا کے جو گایا، اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھینپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر پر یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہو گا کوئی مجھ سا بدنام
جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

ذرا اس شعر کو سنئے اور قیاس کیجئے عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر۔

حال دل ان سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل وجد کے عالم میں تھی۔ ہر شخص محظوظ تھا۔ ہر لفظ پر واہ، ہر سم پر آہا ہا۔ ایک ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گوایا گیا، پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر یہی غزل گوائی گئی۔

مرزا رسوا:۔ وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہو، از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا دیجئے۔ یہ کس کی غزل ہے؟

امراؤ:۔ اوئی، کیا آپ نہیں جانتے؟

رسوا:۔ میں سمجھا!

امراؤ:۔ اور شعر سنئے۔

تالب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا:۔ سبحان اللہ!

امراؤ:۔ واقعی قلم توڑ دیا ہے!

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا:۔ یہ بھی خوب کہا ہے!

امراؤ:۔ اور سنئے۔

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا:۔ یہ فلسفہ ہے، اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ:۔ اور سنئے۔

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینے میں تو جلوہ نما ہوتا ہے